USWA JOURNAL OF RESEAR اُسوہ مجلہ تحقیق

Volume, 04, Issue: 02 (July- Dec 2024)
e-ISSN:2790-5535 p-ISSN:2958-0927
Website: *https://uswa.com.pk/*

گلگت بلتستان کا تاریخی اور ادبی پس منظر

Historical and literary perspective of Gilgit Baltistan

Dr Abid Hussain
Lecturer Kauthar College for Women, Islamabad
Email: Email: abidmutaheri@gmail.com

Abstract:
Gilgit-Baltistan, located in the northern region of Pakistan, is a land of remarkable geographical, historical, and cultural diversity. Surrounded by the mighty mountain ranges of the Karakoram, Himalayas, and Hindu Kush, the region is known for its scenic valleys and has gained global recognition, particularly among tourists. This article explores the linguistic and historical identity of Gilgit-Baltistan, tracing its ancient names such as Sargin and Gari Girit, and the reasons behind these names. Drawing on various historical accounts and scholarly references, the article establishes that Gilgit-Baltistan has no historical or ethnic ties with Kashmir. Instead, its population consists mainly of ancient tribes such as the Brosho and Balor, originating from regions like Badakhshan and Central Asia. The article also discusses the evolution of political systems in the region, from the early tribal settlements to the rule of Azar Jamshid in the 7th century. Overall, the study provides a comprehensive overview of Gilgit-Baltistan's ancient civilization, linguistic development, and socio-political transitions, making it a valuable resource for future researchers.
Keywords: Historical, literary, Himalayas, Gilgit-Baltistan, linguistic

جغرافیائی و تاریخی صورتحال

گلگت بلتستان مختلف اور متنوع تہذیبوں اور زبانوں کا خطہ ہے یہی وجہ ہے کہ پاکستان سمیت دنیا کے مختلف گوش و کنار سے تعلق رکھنے والے سیاحوں کے نزدیک گلگت بلتستان کی منفرد پہچان اور شناخت ہے۔ اردو زبان کی گوشہ گمنامی سے پہلے اس علاقے کی کوئی اچھی شہرت یا شناخت پاکستان اور بیرون پاکستان میں نہیں تھی لیکن جب سے اس علاقے سے متعلق اردو زبان میں کتابیں شائع ہو کر منظر عام پر آئیں تو اس کی شناخت اور شہرت میں اضافہ ہوتا گیا، یہ بات اس علاقے کے حوالے سے عام جاننے والوں کیلئے نئی اور ناقابل یقین ہے لیکن فحص و جستجو اور تحقیق و تنقید سے وابستہ افراد کے لئے اب تک لکھی جانے والی کتابیں ورطہ حیرت میں ڈال دیتی ہیں، چونکہ ان کتابوں میں کچھ ایسے شواہد اور تاریخی، لسانی و ادبی حقائق پیش کئے گئے ہیں جو یقیناً قابل

تفکر ہے خصوصاجب گلگت بلتستان میں اردو کے آغاز اورارتقاء کے لسانی شواہد اور حقائق تلاش کئے جاتے ہیں تو یہاں کی آب وہوا، سیاسی، مذہبی،علاقائی، تہذیبی، معاشی، تعلیمی اوردفاعی تاریخ محقق کوالجھن میں ڈالتی ہے اور محقق کے لئے بدون شرح وتجزیہ گلگت بلتستان کے بارے میں مذکورہ نظریہ قائم کرنامشکل ہوتاہے،اس لئے یہ بات ناگزیر ہے کہ مذکور پیچیدہ صورتحال کوملحوظ نظر رکھ کر گلگت بلتستان کاایک ایساجامع اورکامل تعارف پیش کیاجائے جوہر سطح کے طالب علم کے لیے مفید اور قابل ادراک ہواور مستقبل کے محققین کے لیے گلگت بلتستان کے حوالے سے تحقیق کاآسان راستہ ہموار ہو۔

پاکستان کے شمال میں واقع کوہ قراقرم،ہندوکش اورہمالیہ دیگر پہاڑی سلسلوں میں محصور خوب صورت اوردلکش وادیوں پر مشتمل علاقہ گلگت بلتستان کہلاتاہے جسے پہلے شمالی علاقہ جات کے نام سے جاناجاتاتھا۔گلگت بلتستان نام رکھنے کی خاص وجہ اس علاقے میں دیگرخوبصورت وادیوں اور علاقوں کاشامل ہوناہے،گلگت میں چاراضلاع گلگت،دیامر،غذراوراستور شامل ہیں جبکہ بلتستان میں صرف دواضلاع سکردواور گنگ چھے ہیں۔گلگت بلتستان کے جغرافیائی خدوخال کو معروف ادیب اور قلمکار شیر باز خان برچہ نے کچھ یوں بیان کیاہے۔

"وسط ایشیا اور بر کوچک کے درمیان عظیم ترین پہاڑی سلسلوں کی ایک پر اسرار دنیا آباد ہے جس کی وسعت لاکھوں مربع کلو میٹر پر محیط ہے البتہ ۷۵،۷۱درجہ طول بلد مشرق اور۳۷، ۳۲درجہ عرض بلد مغرب کے مابین ستاسی ہزار ایک سواٹھائیس مربع میل پر مشتمل خطہ پاکستان کے زیر انتظام شمالی علاقہ کہلاتاہے۔"(1)

پروفیسر حشمت کمال الہامی نے گلگت بلتستان کی جغرافیائی تصویر کشی کچھ اس انداز میں کی ہیں

پہاڑی سلسلے چاروں طرف اوربیچ میں ہم ہیں
مثال گوہر نایاب ہم پتھر میں رہتے ہیں

ریاست کشمیر کے شمال مغرب میں اوراس سے بالادریائے سندھ کے دوسرے کنارے پروادی گلگت واقع ہے اس علاقے میں گلگت کے علاوہ استور،دیامر،غذر،ہنزہ،نگر بونجی،اور چلاس شامل ہیں گلگت کا قدیمی نام سارگن تھا۔سار کے معنی جھیل اور گن سے مرادراستہ ہے گلگت کی قدیم تاریخ اورنام گزاری کے متعلق ڈاکٹر امر سنگھ چوہاں لکھتے ہیں

"گلگت دردستان کاجزولاینفک تھادر حقیقت مقامی لوگ دردستان نام کے کسی خطے سے واقف نہیں تھے یہ دراصل مشہوریونانی عالم مورخ ہیروڈوٹس HERODOTU"کامتعارف کردہ نام ہے جسے انگریزوں نے بھی استعمال کیاہے"(2)

شیر باز خان برچہ گلگت کا قدیمی نام اور اس کی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں

"گلگت کو جدی پشتی باشندے سارگن گلیت کہتے ہیں اور یہی اس علاقے کا حقیقی نام ہے، ۱۸۴۶ میں اس علاقے پر پہلی بار سکھ اورڈوگر اراج ہوا تو انہوں نے گلیت کو گلگت کہا، تاہم حقیقت جو بھی ہو یہ نام لوگوں کی زبان پر خوب چڑھا ہے اور آج تک جاری و ساری ہے"(3)

کسی اور جگہ شیر باز خان برچہ سارگن اور گلگت کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"سارگن شاہ بابل نے بہت سے علاقے فتح کیے تو مفتوحہ قبائل کو چہاردانگ عالم تتر بتر ہونا پڑا سارگن کے مفتوحین اور اسیروں میں دردع darda قبیلہ بھی تھا جس نے موجودہ گلگت کے مقام پر جب یہاں جنگل ہی جنگل تھا سارگن کے نام پر بستی قائم کی۔ پھر دردستان کے علاقوں میں آنے والے قبائل نے قدیم قبائل پرُ غلبہ حاصل کیا تو انہوں نے سارگن کا نام بدل کر اس جگہ کا نام اپنے قدیم وطن کے نام پر گلگت رکھا جو فلسطین میں ایک پہاڑی کا نام تھا۔"(4)

عبدالسلام ناز جو ایک ادیب، مورخ اور صاحب نظر قلمکار ہیں اپنی کتاب گلگت اسٹیٹ میں گلگت کا ایک اور قدیمی نام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"گلگت کو ازمنہ قدیم میں گری گرت بھی کہا جاتا رہا ہے گری کا مطلب ہے ہرن جبکہ گرت کا مطلب ہے ناچنا ۔یعنی ہرن ناچنے کی جگہ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے کہ یہاں ہرنوں کی بہتات تھی اور وہ آزادانہ طور پر یہاں گھوما پھرا کرتے تھے"(5)

گلگت بلتسان کی آبادکاری میں کشمیر اور ملحقہ علاقوں کا کوئی کردار نہیں ہے اور نہ ہی گلگت بلتستان کو کشمیر کا حصہ قرار دیا جاسکتا ہے چونکہ تاریخ میں کہیں پر نہیں ملتا کہ کشمیر سے کوئی قوم آکر گلگت بلتستان میں آباد ہوئی ہو اور اس کی جنم بھومی کی وجہ سے یہاں کی آبادی بڑھی ہو بلکہ تاریخی حقائق اس کے برعکس ہے ایک قوم افغانستان سے آکر یہاں آباد ہوئی اور اس کے اثر ونفوذ کشمیر کی آبادکاری کا باعث بنا اور کشمیر کی آبادکاری، جغرافیائی اور تاریخی شناخت میں اہم کردار ادا کیا ان حقائق سے پردہ کشائی کرتے ہوئے عبدالسلام ناز کہتے ہیں

"تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں کشمیر سے کوئی قوم آئی ہے اور گلگت بلتستان کو آباد کیا ہے بلکہ تاریخ یہ کہتی ہے کہ افغانستان کے شہر بدخشان سے ایک قوم اس خطے میں آئی جو بروشو کہلاتی ہے۔ اسی قوم نے بتدریج

کشمیر تک رسائی حاصل کی، کشمیر کو نہ صرف آباد کیا بلکہ اس کی جغرافیائی حیثیت کے پیش نظر نام بھی تجویز کیا اور کوشر نام رکھا جو بعد میں کئی تہذیبوں کے باہم ٹکراؤ کی وجہ سے کوشر سے کشیر اور پھر کشمیر ہو گیا۔"(6)

بروشال نامی اس وسیع و عریض خطے میں بروشو قبائل سے پہلے اوران کے عہد میں خطہ گلگت بلتستان میں ہمیں کشمیری قوم کی جھلک نظر نہیں آئی جہاں ہمیں ان کی موجودگی کے آثار نہیں ملتے اور نہ ہی زمین کا کوئی ایسا ٹکڑا جہاں آباد کاری کی ہو اور نام کشمیر رکھا ہو یہاں تک کہ آریا شین کی خطہ گلگت بلتستان میں آمد کے بعد بھی ہم دیکھتے ہیں کہ کشمیری قوم کا کوئی فرد کسی بھی غرض سے اس خطے میں نظر نہیں آتا وگرنہ بعید نہیں تھا اس خطے کا نام بروشال کے بعد دردستان اور کشمیریوں کی آمد کے بعد لا محالہ کشیرستان ہوتا لیکن تاریخ مین کوئی ایسا نام یا خطہ نہیں ملتا جو کہ گلگت بلتستان کا زمانہ قدیم میں کشمیر سے کوئی لسانی اور جغرافیائی تعلق نہ ہونے پر بین ثبوت ہے۔

شین کی آمد تک بھی گلگت بلتستان میں کشمیری قوم کی موجودگی کا سراغ نہیں ملتا۔ گلگت میں تیسری قوم بلور کے نام سے 'لاسا اصل' سے یہاں آئی بلور قبائل کی آمد کے بعد بلورستان نامی اس ریاست میں بھی کشمیری قبائل کا پرتو اور عکس نظر نہیں آتا، بروشو قبائل نے سب سے زیادہ اس وسیع خطے میں حکومت کی اس کے بعد آریا شین اور بلورنے طویل مدت تک اپنا قبضہ جمائے رکھے۔ بروشو قبائل کی آباد کاری اور گلگت کی قدیم تہذیب کے بارے میں عبدالسلام یوں رقم طراز ہے

"بروشو قبائل گلگت کے قدیم آباد کار ہیں ساتھ ہی ساتھ یہ بھی مانا جا سکتا ہے کہ یہ خطہ اراضی زمانہ قبل از مسیح میں تورانیوں کے آبائی وطن سے ملحق تھا اس خطے کا پرانا نام، بروشو قبائل کی تہذیب و تمدن اور زبان و بیان کی وجہ سے بروشال تھا بروشال کی حدود کافرستان، چترال، کشمیر، بدخشاں، بلتستان، لداخ اور کاشغر تک پھیلی ہوئی تھی"(7)

ایران سے آذر جمشید کی آمد کے بعد گلگت بلتستان کی تاریخ اور جغرافیے میں کافی تبدیلی دکھائی دیتی ہے۔ شری بدت دیوار (شری بت) جو کہ خاندان کیانی کا پہلا بادشاہ تھا، کی موت کے بعد راجگی نظام کا پہلا دور ختم ہو کر ایک اور سنہرا دور شروع ہو جاتا ہے، جو کہ دور ۶۴۳ء سے لیکر ۱۸۰۰ء تک کے عرصے کو محیط ہے راجہ شری بدت کے بعد خاندان کیانی کا تاجدار شاہ آذر جمشید نے ۶۴۳ء کو گلگت کی حکومت اپنے ہاتھوں لے لی وہ تقریبا ۶۴۳ء سے ۶۵۹ء تک بر سر اقتدار رہے ان کے دور میں حکومت کا دائرہ چترال، بشگال جسے نورستان بھی کہا جاتا ہے سے پامیر تک شمالا و جنوبا اور افغانستان کی سرحد بدخشاں سے لیکر کوہ خوش ہام جموں و کشمیر شرقا و غربا تھا تمام قبائلی علاقے ان کی حکومت کے ماتحت تھے جن میں چلاس۔ تانگیر، ہربن وغیرہ شامل ہیں آذر جمشید نے گلگت آکر نور بخت سے شادی کر لی اور ان کے ہاں ایک بیٹا ہوا جس کا نام کرک

خلف تھا آذر جمشید گلگت میں سولہ سال سے زیادہ نہیں ءطرہے ان کے گلگت چھوڑ جانے کے بعد اس کا بیٹا کرک خلف ۶۶۸ءسے ۷۲۳ءتک بر سر اقتدار رہا۔

مورخین کے مطابق ۲۵ سال کی عمر میں وہ گلگت کا حاکم بنا تھا۷۲۳ میں راجہ کرک کا بیٹا راجہ شاہ سو ملک اول نے اقتدار سنبھالا اور ۷۹۳ تک اس نے حکومت کی۔ اس صورتحال پر تاریخی حقائق بیان کرتے ہوئے عبد السلام ناز لکھتے ہیں۔

"یہ وہ دور ہے جب گلگت میں اسلام کا سورج طلوع ہونے لگا تھا اس سے پہلے ۷۸۴ میں امیر کبیر سید علی ہمدانی نے بلتستان آکر تبلیغ اسلام شروع کی تھی اور بلتستان کے گوش و کنار میں پھیل چکا تھا امیر کبیر نے مختصر عرصے میں اپنے بیت سے شاگرد پیدا کئے۔ ان کی کو مشن کو ان کے شاگردوں نے بڑی تیزی سے آگے بڑھایا ان کے شاگردان خاص نے بلتستان سے نکل کر دیگر قبائلی علاقوں کا رخ کیا چنانچہ وہ ہنزہ، نگر، سے ہوتے ہوئے گلگت تک پہنچ گئے دینور کو اپنا دینی اور مذہبی مرکز بنایا اور وہی سے دین اسلام کی تبلیغ اور ترویج شروع کر کے پورے علاقے میں اسلام کا علم بلند کیا۔"(8)

آریاشین کی آمد سے پہلے اور بدھ مت کی ترویج کے بعد گلگت کا قدیم مذہب چھوس بون تھا جس کی بنیاد مظاہر پرستی اور اوہام پرستی پر تھی۔ پہلی بار ۱۳۵۹ء۔۱۳۴۶ اور دوسری بار ۱۳۷۹ء۔۱۳۵۹ کے ادوار میں ہمیں کشمیری قوم کے چند تاجر اور کاریگر گلگت بلتستان میں نظر آتے ہیں کشمیریوں کی آمد کے حوالے سے یہ دور بڑا اہم تصور کیا جاتا ہے۔

۱۸۶ء کو جب ڈوگرہ فوج نے پوری طرح گلگت بلتستان کی بھاگ دوڑ سنبھالی تو والٹی پونیال کے علاوہ تمام امراء جو ڈوگرہ فوج کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے اپنے فیصلوں پہ پچھتانے لگے۔ اس دور میں ڈوگرہ افواج کی طاقت کے زیر اثر گلگت بلتستان کا علاقہ کشمیر کا حصہ بن گیا۔۱۸۷۸ءتک ڈوگرہ گلگت بلتستان پر راج کرتا رہا،۱۸۷۹ء کو گلگت میں پہلی برٹش ایجنسی قائم کی گئی اقتدار کی ڈوڑی ڈوگروں نے انگریزوں اور انگریزوں سے ڈوگروں تک منتقل ہوتی رہی اور گلگت بلتستان کے عوام ظلم وبربریت کی چکی میں پستے رہے۔ آخر کار یکم نومبر ۱۹۴۷ء کو گلگت بلتستان کو اللہ تعالیٰ نے آزادی جیسی عظیم نعمت سے سرفراز فرمایا اور غلامی کا طوق اتار کر سکھ کا سانس لے لی۔

آزادی گلگت بلتستان کے بعد پاکستان سے غیر مشروط الحاق ہوا۔اس غیر مشروط الحاق کو عبدالسلام ناز نے غلط قرار دیا۔ ”آزادی گلگت بلتستان کے بعد پاکستان سے غیر مشروط الحاق میرے نزدیک ایک غلط اقدام تھا شاید یہی وجہ ہے کہ اس کے اچھے برکات و ثمرات سے ہم ابھی تک بہرہ مند نہیں ہو سکے ہیں"(9)

کوہ قراقرم اور ہمالیہ کے وسط مین دریائے سندھ کے دونوں جانب ایک ایسا حسین اور دلکش علاقہ ہے ج و کہ کوہستانی سلسلوں کی وجہ سے پاکستان اور بیرون پاکستان کی نظروں میں مدت مدید تک روپوش اور مخفی رہا۔ لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی خوبصورتی اور دلکشی منصہ شہود پر ظاہر ہونے لگی۔ اس علاقے کو زمانہ حاضر میں بلتستان کہتے ہیں جبکہ زمانہ قدیم میں مختلف متنوع نام سے اس علاقے کو موسوم کیا گیا ہے۔ چین والے بلتستان کو"پولی لو پولو"(Polilo Polu) کے نام سے پکارتے تھے مختلف سیاحوں نے اس علاقہ کانام بلور، بلور لکھاہے جن میں مارکو پولو، فاہی ہان وغیرہ شامل ہیں، یونانی مورخ بطلیموس نے "بیالتے یا بیالتی" کے نام سے ذکر کیا ہے مغلوں نے اسے تبت یا تبت خورد کہا مقامی باشندے بالتی یل کہتے ہیں جو کہ بعد میں کثرت استعمال اور ایرانی مبلغین کی تبلیغ اور فارسی زبان کی وجہ سے بلتستان بن گیا اور آج اسی نام سے مشہور و معروف ہے۔ یوسف حسین آبادی کہتے ہیں:

"آٹھویں صدی عیسوی تک پولولو کے نام سے معروف تھا، تبت اور لداخ والے اس علاقے کو بلتی اور باشندوں کو بلتی پا کہتے ہیں، بلتی اس کا قدیم ترین نام ہے۔ دوسری صدی عیسوی میں یونانی جغرافیہ دان بطلیموس BYLTAE کا ذکر کیا ہے جو محققین کے مطابق بالتی ہی کا تلفظ ہے۔ تبت والے بلتستان کو نانگ گونگ بھی کہتے ہیں۔"(10)

بلتستان کی قدامت اور بلتی نام موسوم ہونے کی تاریخی دلیل پیش کرتے ہوئے بلتستان کے معروف تاریخ نویس محمد نذیر کہتے ہیں:

"بلتستان ایک قدیم خطہ ہے یہاں کی تہذیب کے ارتقاء افراد میں ادب ایک ایسا حوالہ ہے جو علاقے اور معاشرے کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتا ہے، خطہ بلتستان کئی ہزار سال قبل مسیح بھی موجود تھا، جبکہ دوسری صدی قبل مسیح میں یونانی مورخ بطلیموس نے اس علاقے کا ذکر کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بطلیموس کے زمانے میں یہ علاقہ موجود تھا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بلتی یول پکارا جانے لگا۔"(11)

خطہ بلتستان دو پہاڑی سلسلوں کوہ قراقرم اور کوہ ہمالیہ کے وسط میں واقع ہے۔ سلسلہ قراقرم میں کم و بیش تین سو اونچی چوٹیاں ہیں جن میں سے ۱۰۰ سے زائد چوٹیاں بیس ہزار سے اٹھائیس ہزار فٹ کے لگ بھگ بلند ہیں دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی k2 بھی بلتستان میں واقع ہے جو کہ سکردو سے ۱۲۵ میل زمینی اور ۶۵ میل ہوائی دوری پر ہے۔ کے ٹو کو مقامی زبان میں چھوغوری کہتے ہیں، یہ بلتی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی بڑا پہاڑ ہے۔ کے ٹو کو کے ٹو اس لئے کہتے ہیں کہ پیمائش کے

دوران اونچی چوٹیوں کو قراقرم نمبرا اورنمبر۲کی ترتیب سے نام دیا گیا تھاتواس ترتیب کے مطابق مشہ بروم کو کے ون(k1)اور چھو غوری کو کے ٹو(k2)کانام دیا گیا۔

بلتستان میں دوسرا سلسلہ کوہ ہمالیہ کا ہے جو دیامر میں دریائے سندھ سے شروع ہوتا ہے اور بلتستان کے جنوب سے گزرتا ہوا مشرق میں تقریباً ۱۵۰۰ میل دور تک جاتا ہے، ہمالیہ سنکرت زبان کا لفظ ہے، جس کا معنی ہے برف کا گھر۔اس کا صرف ایک حصہ پاکستان میں ہے۔۸۱۲۶ میٹر ۲۶۶۶۰فٹ بلند مشہور چوٹی نانگا پربت اسی حصہ میں واقع ہے، دنیا کی بلند ترین چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ اسی سلسلے کے نیپالی حصہ میں واقع ہے۔یہ چوٹی ۸۸۴۸ میٹر اور ۲۹۶۲۸فٹ بلند ہے۔ہمالیہ کے سلسلے میں بھی متعدد بڑے گلیشیر اور بلند چوٹیاں ہیں۔بلتستان کی قدیم جغرافیائی حدود اور پہاڑی سلسلوں کا ذکر کرتے ہوئے یوسف حسین آبادی کہتے ہیں۔

"بلتستان کی ریاست جب ۱۵۸۸ تا ۱۶۷۳تک عروج پر تھی تو مشرق میں پورانگ اور مغرب میں چترال تک کے تمام علاقے اس کی سرحدوں میں شامل تھے اس وقت جنوب میں زوجی لہ اور شمال میں مستغ قراقرم اس کی سرحد تھے بعد میں بوریگ، ہراموش اور استور کے علاوہ دیگر علاقے الگ ہو گئے۔آخر الذکر دونوں علاقوں کو بعد میں ریاست جموں وکشمیر ڈوگرہ حکومت نے انتظامی لحاظ سے ضلع گلگت میں شامل کر دیا۔"(12)

ڈوگروں نے بھی یوریگ کو بلتستان کا حصہ سمجھا۔لیکن نومبر ۱۹۴۸ء میں بھارتی حکومت نے اس پر جابرانہ قبضہ کرلیا چنانچہ موجودہ بلتستان کے مغرب میں ضلع گلگت اور ضلع دیامر کی وادیاں، مشرق میں بھارتی مقبوضہ اضلاع کرگل ولداخ، شمال میں چینی صوبہ سنکیانگ اور جنوب میں بھارتی مقبوضہ کشمیر واقع ہے یہ علاقہ ۳۴درجہ سے ۳۶ درجہ عرض بلد اور۷۵ سے ۷۷ درجہ طول بلد کے درمیان واقع ہے،قطبین کے بعد دنیاکے سب سے بڑے گلیشیر سیاچن Siachen،بیافو،بلترو،چھو غولو نگما،ریگمو بھی بلتستان میں واقع ہیں۔سید عباس کاظمی کے مطابق بلتستان کے عروج کا دور ۱۵۰۰ء سے ۱۶۰۰ء ہے اس دور میں لداخ کے چنگ تھنگ کے میدانوں سے لیکر پامیر تک اور قراقرم کے انتہائے شمال سے لیکر ہماچل پردیس کے ضلع سپیتی تک پھیلا ہوا تھا لیکن ۱۶۰۰ء سے ۱۷۱۰ء سے علی شیر خان انچن کا دور شروع ہوتا ہے اس دور میں شرقاً وغرباً تبت کی جھیل مانسرور سے لے کر وادی کلاش اور شمالاً وجنوباً قراقرم سلسلہ کوہ کے انتہاے شمال سے لے کر موجودہ کوہستان ہزارہ کی شمالی حدود تک پھیلا ہوا تھا۔بلتستان کا کل رقبہ ۱۰۱۱۸ مربع میل ۲۶۲۰۵ کلو میٹر ہے جس میں سے تقریباً۳۸۸کلو میٹر ۱۹۷۱ کی جنگ میں بھارت کے قبضے میں چلا گیا۔بلتستان کی آبادی 1951 کی مردم شماری کے مطابق

۱۲۵۱۶۲ تھی ۱۹۸۱ء میں محمد یوسف حسین آبادی کے مطابق ۲۲۳۲۹۶ تھی (13) جبکہ بلتی لسانیات کے ماہر سید عباس کاظمی کے بقول ۱۹۸۳ء میں ۲۲۳۰۰۰ کل آبادی تھی (14) ۱۹۹۸ء کی مردم شماری تک اکثر بلتستان کی آبادی بڑھ کے ۳۰۷۵۷۵ تک پہنچ گئی تھی جبکہ محمد حسن حسرت کے مطابق اس وقت کل آبادی ۳۰۳۲۱۴ تھی (15) اس وقت ایک اندازے کے مطابق تقریباً ۱۰لاکھ کے قریب آبادی ہے۔

جغرافیائی لحاظ سے بلتستان میں سکردو، روندو، شگر، خپلو، کھرمنگ اور گلتری کی وادیاں شامل ہیں جو کہ تقریباً ۲۲۹ مواضع پر مشتمل ہیں، یہ علاقہ چونکہ سلسلہ ہمالیہ کے عقب میں واقع ہے اس لئے مون سون ہواؤں کی نعمت سے یکسر محروم ہے یہاں کی آب وہوا سرد اور خشک ہے بارش کی قلت کے باعث قدرتی جنگلات نہ ہونے کے برابر ہیں البتہ پہاڑوں میں نایاب اور قیمتی جڑی بوٹیاں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ دریائے سندھ بلتستان کے وسط سے گزرتا ہے خپلو سے آنے والا دریا کریس کے مقام پر دریائے سندھ سے مل جاتا ہے جسے دریائے شیوک کہا جاتا ہے، یہ دونوں دریا سکردو کے مقام پر شگر دریا سے مل جاتے ہیں اس کے علاوہ سینکڑوں ندیاں اس میں شامل ہو جاتی ہیں۔

وادی بلتستان میں سے ایک سکردو ہے اس کا مقامی نام رگیایُل ہے یہ جغرافیائی حدود اور وسعت کی وجہ سے صدیوں سے بالتی یول کے تاجداروں کا دارالحکومت رہی یہ وادی مہدی آباد گاؤں سے شروع ہو کر مغرب میں بشو کے موضع پر ختم ہو جاتی ہے اس وادی میں دیوسائی بھی واقع ہے جسے مقامی زبان میں غبیار سے کہتے ہیں یعنی گرمیوں میں رہنے کی جگہ۔ یہ میدان تقریباً ۱۰۰ امربع میل پر مشتمل ہے اور سکردو سے سطح سمند ۷۷۰۰ فٹ بلند ہے اس کے علاوہ کھرفوچو قلعہ، سدپارہ جھیل، کچورہ جھیل جیسے مقامات قابل دید ہیں، بلتستان کے باشندے بنیادی طور پر تبتی الاصل ہیں لیکن باہر سے آئے ہوئے یونانی، ایرانی، ترک مغلوں اور کشمیریوں کی آمیزش کی وجہ سے بظاہر تبتیوں سے ذرا مختلف لگتے ہیں۔ بلتستان کے لوگوں کی ظاہری شکل وشمائل، امن پسندی۔ انسان دوستی اور تہذیبی و تمدنی خدوخال بیان کرتے ہوئے سید محمد عباس کاظمی رقطراز ہیں

"بلتی تبتیوں کی نسبت زیادہ خوش شکل اور بلند قامت ہوتے ہیں، فطری طور پر بلتی قوم امن پسند، جرائم سے دور، مہمان نواز اور انسان دوست ہے ایک دوسرے سے بغیر کسی درجہ بندی کے گھل مل جاتے ہیں اور مختلف خوشی، غمی کے موقع پر ایک دوسے کی خوشی اور دکھ میں شریک ہوتے ہیں زمانہ قدیم میں بہت سارے رسوم اور تہوار ہوتے تھے، فصل کی بوئی، کٹائی، موسم بہار اور خزاں کے کچھ رسومات اب بھی مناتے ہیں اور رنگین انڈوں کی لڑائی کا کھیل بہت شوق سے بچے ،جوان کھیلتے ہیں۔"(16)

گلگت بلتستان کی جغرافیائی اور تہذیبی اہمیت کی تاریخی مثال پیش کرتے ہوئے بلتستان کے ماہر لسانیات سید محمد عباس کاظمی کہتے ہیں: "سلطنت مغلیہ کے عروج کے دور میں بھی اس قوم اور یہاں کے بادشاہوں کی عظمت اس درجہ پر تھی کہ مغل اعظم شہنشاہ اکبر نے اپنے ولیعہد شہزادہ سلیم کے لئے پہلی ملکہ کاانتخاب کرنے کے لئے اس قوم کے شاہی خاندان کو چنا۔"(17)

راجہ گوہر امان ۱۸۴۰سے ۱۸۴۲تک گلگت میں اقتدار پررہا۔اس کی حکومت گلگت کے علاوہ یسین سے لے کر چترال تک تھی ملکہ صاحب نما چونکہ اپنے شوہر کریم خان کے ساتھ علاقہ گور میں مقیم تھی اسکی خواہش تھی کہ راجہ گوہر سے ریاست گلگت حاصل کیا جائے چنانچہ کشمیر کے راستے ڈھائی ہزار دور علاقہ گور سے ایک ہزار فوجیوں کی معیت میں انہوں نے راجہ گوہر پر حملہ کیا اس میں گلگت کی عوام نے بھی ان کا ساتھ دیا اس لئے راجہ گوہر امان کو شکست تسلیم کرنا پڑی اور دوبارہ گلگت سے دستبردار ہو کر یاسین چلا گیا۔جون ۱۸۴۸میں سکھ اورڈوگروں نے ایک مرتبہ پھر گلگت پر اپنا قبضہ جمایالیکن اس میں طرہ خاندان کے بادشاہ محمد خان ثانی کی مرضی شامل تھی۔ان کی ملی بھگت سے ایک مرتبہ پھرڈوگرہ راج ہوا۔۱۸۵۲کوڈوگرہ فوج نے چلاس پرحملہ کیاوہاں سے انہوں نے شرپسندوں،باغیوں اورلٹیروں کاخاتمہ کیااسطرح ۱۸۴۸سے ۱۸۵۲تک ڈوگرہ فوج گلگت میں رہی اوراسکے بعد واپس بلتستان چلی گئی۔کیونکہ وہ بلتستان سے ہی گلگت آئی تھی۔

ڈوگرہ راج کے ایک سو آٹھ سالوں میں چار مہاراجاؤں نے جموں وکشمیر ریاست پر حکومت کی۔جن میں مہاراجہ گلاب سنگھ ۱۸۴۰۔۵۷،زنبیر سنگھ ۱۸۵۷۔۸۵جو کہ گلاب سنگ کا بیٹا تھا،اس کے بعد پرتاب سنگھ ۱۸۸۵سے ۱۹۲۵تک جو کہ زنبیر سنگھ کا بیٹا تھاآخر میں پری سنگھ ۱۹۲۸۔۴۸نے حکومت کی،جوپرتاب سنگھ کا بھتیجا تھا۔پری سنگھ ریاست جموں وکشمیر کاآخری ڈوگرہ حکمران رہا۔

ڈوگرہ یہاں بالکل اجنبی اور بیگانہ تھے چونکہ مذہب، نسل، قوم ،زبان اور تہذیب وتمدن کے اعتبار سے ان کا اس علاقے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔یہ لوگ فاتح کی حیثیت سے آئے اور حاکم بن کر حکومت کی۔شروع میں مقامی لوگوں کو سرکاری ملازمت نہیں دی جاتی تھی۔لیکن بعد میں یہاں کے راجاؤں اور بااثر شخصیات کو چھوٹی موٹی ملازمتیں دے دی گئیں۔ڈوگرہ حکومت نے ۱۹۰۲میں پہلی دفعہ یہاں کا قانونی بندوبست ایک انگریز آفیسر آرٹی کلارک کی نگرانی میں مکمل کیا،کس کے ذریعے زمینوں کی اقسام اورفصلوں کی آمدن کی تشخیص کی گئی اوراسی حساب سے چیزوں پر ٹیکس لگادیا گیا۔۱۹۱۶میں بندوبست ثانی مکمل ہوا جس کے مطابق حسب ضرورت مالیہ کی شرح میں ترمیم کی گئی۔اور سختی سے زمین

کی خرید و فروخت پر پابندی عائد کر دی گئی، لیکن یہاں کے مقامی زمیندار پیشہ افراد کو آپس میں خرید و فروخت کی اجازت دے دی گئی۔

یہ وہ افراد تھے جن کے آباء واجداد ۱۸۴۰ سے پہلے بلتستان میں آباد تھے، تجارتی غرض سے آئے ہوئے لوگوں کو زمین خریدنے یا فروخت کرنے کی اجازت نہیں تھی اسی لئے ایک قرن سے زیادہ عرصہ حکومت کرنے کے باوجود کوئی سکھ، ہندو یہاں مستقل طور پر آباد نہ ہو سکا۔

ادبی پس منظر

۱۸۴۰ء میں گلگت بلتستان پر ڈوگرہ راج اور تسلط ہونے کے بعد کشمیر کے ذریعے بلتستان کے لوگوں کا ہندوستان کے ساتھ ایک خاص رشتہ اور تعلق قائم ہو گیا۔ اس تعلق سے پیدا ہونے والی لسانی ہم آہنگی اور اردو زبان کی سرعت کے ساتھ قبول عام کی علت اور سبب بیان کرتے ہوئے محمد حسن حسرت کہتے ہیں:

"اگرچہ ڈوگروں کی زبان بھی خالص وشستہ اردو نہیں تھی بلکہ ان کی زبان ڈوگروی، پہاڑی اور کشمیری زبان کام........ جیسی تھی تاہم یہاں کے لوگ اسے ہندوستانی، زبان کہتے تھے اور ڈوگرہ اہلکار سرکاری خطوط اسی میں لکھتے تھے چونکہ یہ زبان اس علاقے میں اردو ہی کی ابتدائی شکل تھی اس لئے ہم اس کو بلتستان میں اردو کا سرخیل سمجھتے ہیں۔"(18)

چونکہ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت مضبوط ہونے کے بعد بلتستانیوں کی ہندوستان کی طرف باقاعدہ تجارتی اور آمد ورفت کا سلسلہ شروع ہوا اس وقت بلتی قافلے پیدل لداخ کے راستے ہماچل پردیس کی طرف جاتے تھے جن میں اکثریت مزدوروں کی تھی جو مزدوری کی غرض سے سردیوں میں ہندوستان جاتے تھے اور گرمیوں میں وطن واپس آئے تھے یہی افراد عوامی سطح پر بلتستان میں پہلی بار اردو کی ترویج کا سبب بنے ہیں۔

محمد حسن حسرت بلتستان میں اردو کی آمد کی وجہ اور علت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"۱۸۴۰ میں والئی جموں وکشمیر مہاراجہ گلاب سنگھ کی فوج نے حملہ کر کے جب بلتستان پا اپنا قبضہ جمالیا تو ان ڈوگروں کی وساطت سے بلتستانیوں کو قدم قدم پر ہندوستانی زبانوں سے سابقہ پڑا۔"(19)

ڈوگروں کی آمد سے اردو گلگت بلتستان میں زیادہ مقبول زبان بننے لگی اگرچہ اس سے پہلے بہت سی زبانیں رائج تھیں لیکن اردو کے آنے کے بعد لوگ زیادہ تر ایک دوسرے کے ساتھ اردو میں ہی گفتگو کرتے تھے اس بارے میں پروفیسر امین ضیاء کہتے ہیں۔

"شمالی علاقہ جات بذات خود ایک صغیر پاکستان ہے کہ اس وسیع جغرافیائی خطے میں متنوع بولیاں، زبانیں، ذاتیں، نسلیں اور روایتی وثقافتی قدریں پائی جاتی ہیں۔ پاکستان بھر میں یہ اعزاز صرف شمالی علاقے کو حاصل ہے کہ یہاں کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ اردو میں ہی تبادلہ خیالات کرتے ہیں"(20)

۱۸۴۷ھ میں ایک بلتی عالم مولوی عبدالحق تبتی نے تحفہ تبت من اہل سنت کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس میں اس وقت رائج عقائد،احکامات اورعبادات ومعاملات کو تفصیل سے بیان کرنے کے بعد ہندوستان کے علماءسے استفادہ کیا گیا تھااوراس میں مختلف علماء کے فتوے بھی درج کئے گئے تھے۔اب تک کی تحقیق کے مطابق یہ کتاب بلتستان میں اردو زبان میں پہلی تصنیفی یا تالیفی کتاب تھی۔بلتی کا اردو کے لسانی خاندان سے کوئی تعلق نہیں ہے چونکہ بلتی تبتی زبان کی شاخ ہے اور یہاں کے لوگ چھ سوسالوں پہلے تک ہند آریائی،ہند ایرانی،ہندیورپی اور عربی زبانوں سے بالکل نابلد اور ناآشنا تھے چونکہ یہاں کے لوگ دنیاسے بالکل الگ تھلک تھے،لیکن مرورایام کے ساتھ چودہویں صدی عیسوی میں یہاں اسلام آیااوراشاعت اسلام کے ساتھ ہی عربی اور فارسی زبانوں نے بھی جنم لیناشروع کیا،یوں تھوڑی بہت فارسی اور عربی سے آشنائی ہونے لگی۔ فارسی کے ساتھ عربی زبان کا یہاں کی علاقائی زبان کو متاثر کرنا یقینا عربی زبان کی عالمگیریت کی دلیل ہے عربی زبان کی گلگت بلتستان میں آمد کی تاریخی حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہوے ابن اعظم شگری کہتے ہیں

"ریاست جموں کشمیر کے تمام اضلاع میں بدھ مت کے پیروکار تھے ایک مذہب ہونے کی وجہ سے تمام اضلاع میں ایک ہی رسم ورواج ایک ہی تہذیب ایک ہی زبان اور ایک ہی طرز زندگی تھی لیکن جب نور اسلام نے دور دور تک ضوفشانی کی توجناب سید محمد عراقی کت قدم مبارک کی برکت سے کشمیر کے علاقہ بلتستان بھی چمن اسلام کے عصر بیز جھونکوں سے معطر ہونے لگا جس کی وجہ سے لداخ اور بلتستان میں ایک ہی مذہبی انقلاب آیا نتیجتا یہاں کے رسم و رواج علم و ادب طرز معاشرت سے لداخ سے بالکل مختلف ہو گیا"(21)

فارسی زبان نے ہندوستان اور مضافاتی علاقوں میں جلد ہی اپنااثر ونفوذ دکھاناشروع کیا۔ توبرصغیر کے دیگر علاقوں کی طرح بلتستان میں بھی فارسی درباری، تدریسی اور تجارتی زبان بن گئی،راجاؤں کے فرمان،وثیقے،خطوط اور ہبہ نامے بھی فارسی میں لکھے جاتے تھے اور کاروباری لین دین بھی فارسی میں ہوتے تھے۔فارسی زبان کی سرعت پذیری اور اردوزبان کے گلگت بلتستان میں فروغ فارسی کی اہمیت اور حیثیت کو بیان کرتے ہوئے محمد حسن حسرت لکھتے ہیں

"یہ حقیقت اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ فارسی کی بدولت اردو کو بلتستان میں پھلنے اور پھولنے کا موقع ملا"(22)

جموں وکشمیر کے والی مہاراجہ گلاب سنگھ کی فوج نے جب ۱۸۴۰ میں حملہ بلتستان پر حملہ کر کے اپنا تسلط اور جابرانہ قبضہ جمایا تو یہاں کا ماحول اور مزاج بھی بدل گیا ڈوگروں رفت آمد اور قیام پذیری کی وجہ سے بلتستان کے لوگوں کو قدم قدم پہ ہندوستانی زبانوں سے واسطہ پڑا، اور روزمرہ کی ضرورت۔ لین دین کے لیے مخلوط اردو کو رابطے کی زبان کے طور پر استعمال کرتے تھے اگرچہ ڈوگروں کی زبان بھی خالص اردو نہیں تھی بلکہ دیگر زبانوں کی آمیزش سے بنی ہوئی ایک مخلوط زبان تھی لیکن یہاں کے لوگ اسے ہندوستانی زبان کہتے تھے اور تمام تر سرکاری خطوط ، وثیقے ،اور سرکاری دستاویزات اسی زبان میں لکھتے تھے اس لئے اس زبان کی اہمیت زیادہ تھی چونکہ یہ زبان اس علاقے میں اردو ہی کی ابتدائی صورت تھی جو جموں وکشمیر کے علاقوں میں پھیل رہی تھی اس لیئے ہم اس کو بلتستان میں اردو کا آغاز قرار دیتے ہیں۔ ۱۹۰۲ میں بلتستان میں جب بندوبست اراضی کا کام مکمل ہوا تو بندوبست کے سارے کاغذات اردو میں مرتب ہوئے آج تک محکمہ مال کی تمام کاروائیاں اردو میں ہی ہوتی چلی آرہی ہیں۔ حالانکہ دیگر محکموں میں انگریزی زبان کا غلبہ اور رواج ہے، اردو کا استعمال اور اس کی اہمیت بڑھ گئی تو اسکی نشوونما میں بھی تیزی آگئی۔ آہستہ آہستہ فارسی کا اثر ونفوذ ختم ہوا اور اردو نے مستقل طور پر فارسی کی جگہ لے لی۔ اس بارے میں بلتستان کے معروف شاعر ،افسانہ نگار اور ماہر لسانیات مرحوم غلام حسن حسنی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں: "بلتستان میں اردو نے جتنی سرعت سے قبول عام کا درجہ حاصل کیا اس کی مثال کوئی اور زبان پیش کر سکتی" (23)

۱۸۹۰ میں فارسی کے ساتھ اردو کا بھی استعمال شروع ہوا مہاراجہ اور انگریزوں کے اہلکار، مدارس میں پڑھانے والے پنڈت اور دیگر اساتذہ جو آئے وہ صاحبان علم وادب ہوتے، مولوی حشمت اللہ خان لکھنوی، محمد عبداللہ وزیر وغیرہ تھے۔ اس دور میں اردو نے نوزائیدہ بچے کی مانند آہستہ آہستہ چلنا اور قدم جمانا شروع کیا اور دن بہ دن اردو کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھتا گیا پروفیسر عثمان نے اپنے ایک مضمون "شمالی علاقہ جات کے قلمکار اور قومی دھارا" میں یہاں کے ماضی کی تمام ادبی میراث سے یکسر بی اعتنائی برتتے ہوئے ۱۹۴۷ء سے پہلے کے دور کو دور بے ادب کہا ہے

"بہر حال ۱۹۴۷ء سے پہلے کا دور جور و جفا کا دور تھا مالیات۔ ٹیکسوں اور محصولات کے بوجھ تلے دبے اذہان ادب تخلیق کرتے تو کیسے کرتے بیگاری فرائض بجالاتے لاتے ان کی کمریں خم ہو چکی تھیں اس استعمارانہ ماحول کے اندر پلے بڑھے افراد کو نظریں نیچی کرنا، ہاتھ جوڑنا اور چومنا سکھایا اونچ نیچ کی ان قدغنوں میں عام لوگ پژمردہ، بے حس، بے زبان اور بے جان پڑے رہتے۔ چنانچہ ہمیں اس دور میں ادب نام کی کوئی شے نظر نہیں آتی۔ مقامی زبانیں بھی کوئی رسم الخط اور حروف تہجی کے نہ ہونے کی وجہ سے ادب کے لیے نارسا تھیں اس لیے اس دور کو "دور بے ادب" کہا جائے تو بے جانہ ہو گا" (24)

جبکہ حقیقت حال اس کی تائید نہیں کرتی ۱۹۴۷ء سے پہلے کئی اہل فکر و قلم نے اردو اور فارسی زبان سے مخلوط ادب تخلیق کیا جن کی مثالیں آئندہ سطور میں پیش کی جائیں گی ۔گلگت میں ۱۸۶۰ سے ۱۹۴۷ کا دور اردو زبان کی ترقی کا ابتدائی دور قرار دیا جاسکتا ہے اس ابتدائی دور میں ہمیں مقامی اردو شعرا کے کوئی زیادہ نام نہیں ملتے چند ایسے شعرا ہیں جو اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے ان میں علامہ نصیر الدین نصیر ہنزائی، مولوی راجی رحمت نظر، وزیر محمد اشرف خان اشرف شامل ہیں، علامہ نصیر الدین ہنزائی اردو، فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں ان کی شاعری پر ابتدا سے ہی تصوف کا رنگ غالب نظر آتا ہے وزیر محمد اشرف خان اشرف علی گڑھ کے فارغ التحصیل تھے انہوں نے ایک ادبی ماحول میں تعلیم حاصل کی ہے ان کی اردو زبان پر دسترس اور اردو سے لگاؤ کا اندازہ اس شعر سے ہوتا ہے؛

روئے چمن پہ ابر سیہ چھا رہا ہے یوں

جیسے نگار زلف پریشان کئے ہوئے (25)

مولوی راجی رحمت نظر بھی اردو زبان وادب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے وہ طنز و مزاح میں کافی شہرت رکھتے تھے، ایک شعر ملاحظہ ہو؛

ایک پیسہ میں بھی دوں گا گرچہ خالی ہاتھ ہوں

جب سنوں کشمیر پاکستان میں شامل ہوا (26)

ابتدائی دور میں شاعری کی محفلیں نہ ہونے کے برابر ہیں لیکن مدارس اور سکولوں میں بہت بازی کی محفلیں عام ہوتی تھی جو کہ شعری ذوق کو بڑھانے کے لئے کافی مددگار ثابت ہوتی تھی۔اس دور میں سکولوں اور عوامی سطح پر ڈرامے سٹیج کئے جاتے تھے انماحشر کے ڈرامے پڑھتے اور سٹیج شو کرتے تھے، علامہ اقبال کے اشعار لوگ پڑھتے اور یاد کرتے تھے ان کے اشعار اساتذہ اور طلبا کی زبان پہ ہمیشہ جاری رہتے تھے۔

یہ دور ۱۸۱۹ سے لیکر ۱۹۲۴ تک کے طویل عرصے کو شامل ہے، اس دور میں اردو زبان کا ابتدائی ہیولی اور شکل تیار ہوئی۔اسے سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوا اور سکولوں میں ذریعہ تعلیم کے طور پر اردو رائج کیا گیا لیکن ہمیں اس دور میں اردو ادب کے کوئی واضح نقوش اور آثار نظر نہیں آتے غالباً اس کی وجہ یہی ہوگی کہ اس دور میں ڈوگرہ راج نے گلگت بلتستان میں عوام کو ظلم وستم کی چکی میں پیسا کے رکھ دی۔مالیات، ٹیکسوں کی ادائیگی غلامی کے فرائض کو انجام دینا عوام کی ذمہ داری

تھی اور عوام کو حکام نے حقیقی معنی میں غلام بنا کے رکھا تھا ساتھ ہی ساتھ تعلیمی سہولتیں اور وسائل کا بھی فقدان تھا اس وجہ سے ادب کی آبیاری نہیں ہوئی۔ اسی لیئے بعض لوگوں کے ہاں یہ دور دورِ بے ادب کے نام سے موسوم ہے۔

گلگت بلتستان میں ۱۸۵۵ کے قریب راجہ مراد علی خان اماچہ کا ایک شعر ملتا ہے جو کہ اس علاقے میں تقریباً پہلا دستیاب اردو شعر ہے؛

محبوب ویارو دلبر جو کچ کہ ہوسی زر ہے
مادر پدر برادر، جو کچ کہ ہوسی زر ہے(27)

مندرجہ بالا شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ گلگت بلتستان میں ابتدائی اردو ڈوگری، فارسی اور پنجابی زبان کی آمیزش سے وجود میں آئی، اور اردو ادب میں ابتدائی طور پر اسی زبان کا استعمال ہوا۔ انتہائی کم عرصے میں ہی یہاں کی اردو فصیح زبان بن گئی، راجہ مراد خان کے دوسرے شعر میں نسبتاً صاف اور عام فہم اردو کا استعمال کیا گیا ہے؛

آپ کی صحبت کو میں حد سے غنیمت جانتا
جس طرح میں جانتا ویسا غنی مت جانتا(28)

اس دور میں باقاعدہ طور پر اردو زبان کو شاعری کے لئے پہلی دفعہ مراد علی خان مراد نے ہی اختیار کیا جس کی علت یہ تھی کہ وہ جموں میں اپنے والد کے ہمراہ قید میں رہے ان کے والد فارسی اور بلتی شاعری میں کافی شہرت رکھتے تھے، زندان میں بھی ان کے والد صاحب نے انہیں شعری اسلوب اور صنائع وبدائع کے رموز سکھاتے رہے مراد خان نے اپنے والد سے مختلف صنائع کے استعمال کے طریقے اور قطعہ ٔ تاریخ میں بھی سیکھا چونکہ وہ فارسی بلتی اور اردو میں تاریخ کہا کرتے تھے ان کا ایک دستیاب قطعہ ملاحظہ ہو،

زراقم چو تاریخ جستند گفت
دوبارہ ثمر خان تاریخ را
تاریخ اور خرد نے کہا زین عجب سنو
تاریخ ایں کتاب علی شیر خان کہو(29)

اس قطعے کے علاوہ مراد علی خان مراد کی ایک طویل منقبت بھی ہے جس کا زمانہ تحریر ۱۸۶۰ کے قریب ہے، اس منقبت کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

ہے یہ مدح جناب ولایت مآب کی

نایب مناب ختم رسالت مآب کی

جس شخص کو خدانے ز غفلت جگادیا

اس دل میں حب ششاہ ولایت جگادیا

در ہر دلیکہ مہر علی کی ضیادیا

گویا خدا برات، برات دیادیا

سیف اللہ وید اللہ وشیر خدالقب

اس کے سوا کس کو خدانے بھلادیا

دیکھو ولایت شہہ دیں رود نیل میں

جبرئیل کو خدا کی صفت سب سکھادیا

گہوارے میں سب کو خبر سب کو مار لیا

سیلی سی جہل دوں کا اوسی مو بھرادیا

از امرِ حق زب ہر نبی ووصی او

مہ پارہ گشت ومہر دوبارہ مرادیا

جس دن یتیم وسائل ومسکین کونان دیا

ایزد نے اس عطا کو اوسے ھل اتیٰ دیا

انگوٹھی در نماز بہ سائل بنام حق

اس بے بساجواہر سنگین چکادیا

بت ہائے بے شمار بہ ارشاد کردگار

ان خانہ زاد کعبہ ز کعبہ مٹادیا(30)

اس دور میں یہاں اردو زبان نے ادب کی صورت اختیار کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی چونکہ ابتداء میں یہ زبان ڈوگری اور پنجابی سے جڑی رہی اس کے بعد فارسی سے قربت ہوئی اس وجہ سے بلتستان کی کشمیر سے زمین رابطہ اور دوسرا مقامی لوگوں کا فارسی زبان وادب سے قلبی لگاؤ تھا ماضی میں ایرانی مبلغین کا لاہور تک کا سفر اسی علاقے سے گزر کر ہی مکمل ہوتا تھا، یہی وجہ سے کہ اس علاقے میں فارسی سے گہری وابستگی اور قربت ملتی ہے۔

اس دور میں اردو کی مقبولیت اوراردو زبان سے لگاؤ کا اندازہ مقامی شعراء کا اردو سے متاثر ہو کر بلتی شاعری کو اردو رسم الخط میں لکھنے سے لگایا جا سکتا ہے راجہ مراد کے دور میں بلتی زبان کے معروف شعرا جوہر علی جوہر، اور سید ابوالحسن نے بلتی شاعری کو اردو رسم الخط میں لکھنا شروع کیا اور اردو کے الفاظ کثرت سے استعمال کئے درحالیکہ اس دور میں بلتی زبان کا مستقل رسم الخط موجود تھا اس کے باوجود بلتی شعرا نے اردو زبان کو اپنالیا اس سے اردو زبان کی ان علاقوں میں شہرت اور مقبولیت واضح ہو جاتی ہے۔ سرکاری طور پر اردو رسم الخط کا رواج ہونے کے بعد بلتی شعرا کو اپنے کلام کی آسان تحریر کا راستہ مال اور انہوں نے اپنے کلام کو تحریری شکل دینا شروع کر دی جس کی بارز ترین مثال بلتستان کے معروف شاعر سید ابوالحسن تحسین ہے، جو کہ فارسی اور بلتی شاعری میں اہم مقام رکھتے تھے۔

گلگت اور بلتستان میں سے سب سے پہلے اردو ادب اور شاعری ہمیں بلتستان میں ملتی ہے، دیگر زبانوں کے لئے رسم الخط کا استعمال بھی بلتستان کے شعرانے شروع کیا، اردوادب کی ابتدامیں صرف شاعری ملتی ہے جو کہ زیادہ تر منقبت، قصیدہ، نوحہ، مرثیہ اور قطعات کی ہیئت میں ہے بلتستان کے علاوہ کسی دوسے علاقے میں اس دور کے متعلق ادب کے نمونے اب تک کی تحقیق کے مطابق دستیاب نہیں ہے۔ ۱۸۸۹ میں انگریزوں نے گلگت ایجنسی قائم کی جس کی بدولت اردو زبان کے ساتھ ساتھ ادب کو بھی فروغ ملا۔ اس دور میں ماسٹر غلام حیدر اردو ڈراموں کے حوالے سے کشمیر میں مشہور تھے، جب وہ گلگت کے سکول میں تعینات ہوئے تو انہوں نے وہاں پہ ڈرامے کی روایت کو آگے بڑھایا جس سے اردو ادب کی بہت زیادہ ترویج و تشہیر ہوئی، ان کے علاوہ دیگر اساتذہ نے بھی گلگت، ہنزہ اور دیگر علاقوں کے عوام میں اردو شاعری کا ذوق پیدا کیا جس سے اردو شاعر چوہدری خوشی محمد ناظر کو گلگت اور لداخ میں بحیثیت منتظم تعینات کئے گئے۔ ان کی آمد ان علاقوں میں اردو ادب اور شاعری کے فروغ کے لئے کافی خوشگوار ثابت ہوئی، اردو حلقوں میں ان کی وجہ سے نئی جان آگئی۔ چوہدری خوشی محمد ناظر کشمیر کے مشاعروں میں شرکت کرنے کے علاوہ انجمن حمایت اسلام اور انجمن اسلامیہ جموں کے سالانہ جلسوں اور مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے اور وہاں اپنا کلام سناتے تھے وہ مشہور نظم "جوگی" کی وجہ سے مقبول

ہوئے، اس کے علاوہ انہوں نے کشمیر کے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھی، گلگت میں تعیناتی کے بعد ان کی شاعرانہ مقبولیت کی وجہ سے وہ گلگت میں بھی مشہور ہوئے۔ انکی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں اورادبی ذوق کی بدولت اردو مشاعروں کا گلگت میں بھی رواج ہوا۔ اور اردو شاعری کا رجحان بڑھتا گیا۔

خوشی محمد ناظر کے بعد سید اکبر علی، سردار محمد اکبر خان، راجہ فرمان علی اور عبد اللہ صاحب جو کہ مسلمان وزراء تھے ان لوگوں نے بھی لداخ میں یعنی بلتستان میں اردو زبان وادب کی ترویج میں اہم کردار ادا کئے۔

۱۹۲۵ سے لیکر ۱۹۴۶ تک کے دور میں بھی گلگت بلتستان میں اردو زبان وادب دن بہ دن ترقی کرتا نظر آتا ہے۔ اس دور میں اردو کتابوں کی اشاعت اردو ادب کے فروغ میں سب سے پہلا محرک ثابت ہوئی اس دور کا آغاز ۱۹۲۵ سے کرنے کی وجہ بھی یہی ہے، چونکہ اسی سال اردو کی پہلی کتاب تحفہ تبت من اہلسنت مؤلف مولوی عبد الحق تبتی منظر عام پر آگئی اس کتاب میں فارسی اور عربی کتابوں، نہج البلاغہ اور فقہ الاحوط کے اقتباسات اور متن کی وضاحت آسان اور سلیس اردو میں کی گئی جس کی وجہ سے گلگت بلتستان میں یہ کتاب بہت مشہور ہوئی، عوام نے بہت زیادہ پسند کیا اور مزید اردو کتابوں کی ضرورت بھی محسوس ہوئی۔ اسی ضرورت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چار سال بعد مولوی حمزہ علی نے تین ضخیم اردو کتابیں تصنیف کیں، اور فوری شائع کر کے عوام میں مقبول ہوئے۔ ان کی پہلی کتاب فلاح المؤمنین ہے جو کہ ۴۰۰ سے زاید صفحات پر مشتمل ہے۔

دوسرے دور کے آغاز میں ہم دیکھتے ہیں کہ اردو کو عوامی سطح پر پزیرائی مل چکی تھی یہی وجہ تھی کہ علماء کرام مساجد میں مذہبی مسائل کے بیان اور جمعہ کے خطبے اردو میں دینے لگے تھے۔

اس دور میں گلگت بلتستان کی اردو شاعری میں کئی نئی اصناف بھی شامل ہوئیں۔ جن میں قطعہ، رباعی، اور مخمس ہیں، اس دور میں فارسی سے مخمس اردو شاعری میں مقبول ہوئی راجہ محمد غریق کریس کی ایک مخمس جو کہ بقول راجہ محمد علی شاہ صبا ۱۹۹۵ کے لگ بھگ تحریر کی گئی تھی کا ایک نمونہ ابتدائی اردو مخمس کی صورت میں ملتا ہے۔ یہ مخمس انہوں نے راجہ محمد علی شاہ صبا کو عید غدیر کے موقع پر مبارکبادی کے لئے ارسال کیا تھا جس کی نسبت سے مخمس غدیر یہ کہا جاتا ہے اس مخمس میں اردو سے زیادہ فارسی الفاظ اور تراکیب ہیں،

آج صہبائے ولائے اہل دل مدہوش ہے
بادہ نوشان محبت کومئے مدہوش ہے

برلبِ خم غدیری بانگِ نوشانوش ہے
کنت مولاہ کادرآویزہ ہر گوش ہے
آج دنیامیں امیر المؤمنین مولاہوا(31)

تھیٹر کے ذریعے اردوادب کے فروغ کے لئے اس دور میں سکردو میں ایک ڈرامیٹک کلب بھی بنایا گیاجو کہ بلتستان ڈرامیٹک کلب کے نام سے مشہور تھا،اس کلب نے ڈرامے کے ساتھ اردو ملی نغموں کو بھی فروغ دیا،۱۹۴۸ کے انقلاب میں گلگت سے جو فوج سکردو آئی تھی اس میں کمانڈر.A.P.A کے بیٹے فخر محمود اور سکینڈ کمانڈرشاعر غلام مہدی مرغوب تھے انہوں نے ایئرپورٹ کی ڈیوٹی کے ساتھ سکردو میں شاعری اورڈرامے کی محفلیں سجائیں۔۱۴اگست۱۹۴۸کوانہوں نے پولوگراونڈ سکردومیں محفل موسیقی کاپہلاپروگرام کیاجس میں اردو غزلوں، نظموں اور ملی نغموں کو پہلی مرتبہ عوامی سطح پر متعارف کیاگیا۔

اس دور میں تقسیم برصغیر اورآزادی کی جدوجہد سے باخبر رہنے کے لئے لوگ ریڈیوشوق سے پابندی کے ساتھ سنتے تھے،حالات حاضرہ کے پروگراموں کے علاوہ آل انڈیاریڈیو کے پروگراموں میں بھی لوگ دلچسپی لیتے تھے۔ان ریڈیو پروگراموں نے گلگت بلتستان میں اردو نغموں کو بہت زیادہ فروغ دیا،انہی نغموں اور گیتوں کی وجہ سے عوام اورخواص غیر شعوری طورپر اردو شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔اردو شاعری میں علامہ اقبال کے کلام کو لوگ شوق سے سنتے تھے جو کہ درحقیقت اس وقت کی ضرورت بھی تھاعلامہ اقبال کی نظمیں مختلف جلسوں اور محافل ومجالس میں پڑھی جانے لگیں اقبال کی اپنی نظموں نے عوام کے اندر ملی اصلاح اور ملی شاعری کاجذبہ بیدارکیا، جلسوں، جلوسوں اور سکولوں میں ہمالہ اوربچے کی دعا اوردیگر نظمیں گائی جاتی تھیں، مجموعی طورپراس دور میں عوام کی سوچ اوراجتماعی شعور میں کافی حدتک تبدیلی آئی۔اوراردو شاعری کی طرف لوگوں کامیلان بڑھتاگیا۔

حوالہ جات:۔

۱۔شیر باز خان برچہ،گلگت بلتستان میں صحافت کا ارتقاء،مشمولہ:جلوہ شمال،الحاج ابراہیم زائر،بلتستان ادبی بورڈ،سکردو،جون ۱۹۹۹ء، صفحہ ۳۴

۲۔امر سنگھ چوہاں،ڈاکٹر، تاریخ گلگت، مترجم:ڈاکٹر عظمی سلیم، شیر باز خان برچہ، جمہوری پبلیکشنز لاہور، مئی ۲۰۱۲، صفحہ ۱۲

۳۔شیر باز خان برچہ، گلگت میں اردو، مشمولہ:پاکستان میں اردو(اباسین)، مرتبین پروفیسر فتح محمد ملک،سید سردار احمد پیرزادہ، تجمل شاہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، جلد نمبر ۳، صفحہ ۱۵۲

۴۔شیر باز خان برچہ، گلگت میں اردو، مشمولہ اخبار اردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، اگست ۲۰۰۳، صفحہ ۶۶

۵۔عبد السلام ناز، گلگت اسٹیٹ، گل بکاؤلیز پبلیکشنز گلگت، گلگت، جنوری ۲۰۱۲، صفحہ ۶۱

۶۔ابن اعظم شگری، ہماری شاعری، مشمولہ:سہ ماہی بلتستان، سکردو، ۱۹۶۰ء، صفحہ ۲۶

۷۔عبد السلام باز، گلگت اسٹیٹ، گل بکاؤلیز پبلیکشنز گلگت، گلگت، جنوری ۲۰۱۲ء، صفحہ ۶۵

۸۔ایضاً ً، صفحہ ۹۰

۹۔ایضاً ً ً، صفحہ ۱۸۹

۱۰۔یوسف حسین آبادی، تاریخِ بلتستان، بلتستاب بک ڈپو نیابازار سکردو، سکردو، طبع دوم، ستمبر ۲۰۰۸ء، صفحہ ۱

۱۱۔محمد نذیر، بلتستان میں اسلامی ادب، مشمولہ:معراج ادب، حلقہ علم وادب سکردو بلتستان، شمارہ اول، اگست ۱۹۹۸۔۱۹۹۹، صفحہ ۸۹

۱۲۔یوسف حسین آبادی، تاریخِ بلتستان، بلتستاب بک ڈپو نیابازار سکردو، سکردو، طبع دوم، ستمبر ۲۰۰۸ء، صفحہ ۳

۱۳۔یوسف حسین آبادی، تاریخِ بلتستان، بلتستاب بک ڈپو نیابازار سکردو، سکردو، طبع دوم، ستمبر ۲۰۰۸ء، صفحہ ۴

۱۴۔سید عباس کاظمی، بلتی لوک گیت، لوک ورثہ اشاعت گھر اسلام آباد، اپریل ۱۹۸۵ء، صفحہ ۲۶

۱۵۔محمد حسن حسرت۔بلتستان تہذیب و ثقافت، بلتستان بک ڈپو اینڈ پبلیکشنز نیابازار سکردو، اشاعت دوم، ۲۰۰۷ء صفحہ ۴۵

۱۶۔سید عباس کاظمی، بلتی لوک گیت، لوک ورثہ اشاعت گھر اسلام آباد، اپریل ۱۹۸۵ء، صفحہ ۳۰

۱۷۔سید عباس کاظمی، بلتی لوک گیت، لوک ورثہ اشاعت گھر اسلام آباد، اپریل ۱۹۸۵ء، صفحہ ۵

۱۸۔محمد حسن حسرت۔بلتستان تہذیب و ثقافت، بلتستان بک ڈپو اینڈ پبلیکشنز نیابازار سکردو، اشاعت دوم، ۲۰۰۷ء صفحہ ۱۲۶

۱۹۔ایضاً ً

۲۰۔امین ضیاء، پروفیسر، شمالی علاقہ جات کا اردو ادب (حصہ نظم)، حلقہ ارباب ذوق گلگت، صفحہ ع، سن ندارد

۲۱۔ ابن اعظم شگری، ہماری شاعری، مشمولہ: سہ ماہی بلتستان، سکردو، ۱۹۶۰ء، صفحہ ۲۶

۲۲۔ محمد حسن حسرت، بلتستان میں فروغ اردو کے محرکات، مشمولہ: پاکستان میں اردو (اباسین)، مرتبین پروفیسر فتح محمد ملک، سید سردار احمد پیرزادہ، تجمل شاہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، جلد نمبر ۳، صفحہ ۲۹۷

۲۳۔ عثمان علی، پروفیسر، شمالی علاقہ جات کے قلمکار اور قومی دھارا، مشمولہ: جلوۂ شمال، الحاج محمد ابراہیم زائر، بلتستان ادبی بورڈ سکردو، جون ۱۹۹۹ء

۲۴۔ عثمان علی، پروفیسر، گلگت مین اردو شاعری منزل بہ منزل، مشمولہ: فکر و نظر سہ ماہی گلگت بلتستان، ۲۰۱۲ء صفحہ ۲۱

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ عظمی سلیم، ڈاکٹر، شمالی علاقہ جات میں اردو زبان و ادب، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، طبع اول ۲۰۰۸ء، صفحہ ۱۳۳

۲۷۔ ایضاً صفحہ ۱۳۴

۲۸۔ حسن خان اماچہ، راجہ، پیغام آشنا، ایرانی ثقافتی قونصلیٹ اسلام آباد، ۲۰۰۴ء صفحہ ۱۳۷

۲۹۔ محمد علی شاہ صبا، راجہ، بلتستان میں اردو زبان، مشمولہ اخبار اردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، اگست ۲۰۰۳، صفحہ ۶۷

۳۰۔ محمد علی شاہ صبا، راجہ، بلتستان میں اردو زبان، مشمولہ: پاکستان میں اردو (اباسین)، مرتبین پروفیسر فتح محمد ملک، سید سردار احمد پیرزادہ، تجمل شاہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، جلد نمبر ۳، صفحہ ۲۹۱

۳۱۔ عظمی سلیم، ڈاکٹر، شمالی علاقہ جات میں اردو زبان و ادب، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، طبع اول ۲۰۰۸ء، صفحہ ۱۴۷